مؤسس انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی اپنی دلی خواہش اور جدوجہد کے تقاضوں کے عین مطابق، مرحوم کے تمام قانونی وارثین ہر مسلمان کو ڈاکٹر صاحبؒ کی طبع شدہ تصنیفات/ تالیفات، آڈیوز، ویڈیوز کو طبع/ تیار کر کے شائع کرنے کی کھلی اجازت دیتے ہیں (چاہے قیمتاً ہو یا مفت تقسیم) اور اس کے لیے کسی پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کسی قسم کی رائلٹی یا ''محفوظ حقوق'' کا تقاضا بھی نہ ہے اور نہ ہوگا، البتہ تیار کردہ مواد (آڈیوز یا ویڈیوز) اور کتب کے چند نسخے ہمارے ریکارڈ کے لیے بھیج دیے جائیں تو ممنون ہوں گے۔ تاہم ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی ناپسندیدہ کوشش مثلاً تبدیلی الفاظ، غلط اقتباس، سیاق و سباق سے الگ کر کے جملے کا حوالہ یا اس کا ایسا استعمال جس سے ڈاکٹر صاحب مرحوم اور ہمارے موقف کی صحیح ترجمانی نہ ہو اور جس سے ہماری عزت و شہرت پر حرف آئے، تو ہم اس شخص کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا مکمل حق محفوظ رکھتے ہیں۔

نام کتابچہ ——— حب رسول ﷺ اور اس کے تقاضے

طبع 1 تا 13 (اکتوبر 1991ء تا نومبر 2016ء) ——— 25,000

طبع 14 (ستمبر 2020ء) ——— 2200

ناشر ——— ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 35869501-3

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ——— 20 روپے

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے تقاضے

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

ترتیب وتسوید: شیخ جمیل الرحمٰن

اسلامی جمیعت طلبہ علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور کی دعوت پر محترم ڈاکٹر صاحب نے یونیورسٹی کیمپس میں کالج کے ہاسٹل کی مسجد میں ۱۴ نومبر ۸۷ء کو یہ خطاب ارشاد فرمایا تھا جسے شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے ٹیپ کی ریل سے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا۔

الحمد للّٰہ و کفی والصّلاۃُ والسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی خصوصاً علٰی افضلھم و خاتم النّبیّین محمد الامین و علٰی آلہ و صحبہ اجمعین۔ اما بعد
فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرَّجیم بسم اللّٰہ الرَّحمٰن الرَّحیم

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ (الحدید)

و قال تبارک و تعالٰی:

ھُوَالَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ؕ (الفتح)

وقال اللّٰہ عزو جل:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (آل عمران) ...... صَدَقَ اللّٰہُ مَوْلَانَا الْعَظِیْمُ

ان آیات کی تلاوت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے درودِ ابراہیمی پڑھا اور ارشاد فرمایا:

عزیز طلبہ! مجھے ابھی یہ بتایا گیا ہے کہ اس وقت کی میری گفتگو کا موضوع ''حبِ رسولؐ اور اس کے تقاضے'' رکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے یہ بات میرے علم میں نہیں آئی تھی' بلکہ مجھے عمومی انداز میں کہا گیا تھا کہ مجھے سیرتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے موضوع پر گفتگو کرنی ہوگی —— بہرحال ان دونوں چیزوں کے مابین کوئی زیادہ فرق اور بُعد نہیں ہے' ان کو آسانی سے باہم جوڑا جا سکتا ہے۔ یہ لازم وملزوم ہیں۔ لیکن میری آج کی گفتگو زیادہ تر جس تناظر میں ہوگی وہ سورۃ الحدید کی وہ آیتِ مبارکہ ہے جس پر میں ابھی قرآن اکیڈمی میں مفصّل درس دے کر آ رہا ہوں۔ میں نے آج کے اس اجتماع میں حاضری سے اسی بنیاد پر معذرت کی تھی کہ ہفتہ کو بعد نمازِ مغرب قرآن اکیڈمی میں میرا درسِ قرآن ہوتا ہے۔ ہم وہاں گزشتہ آٹھ ہفتوں سے سورۃ الحدید کا سلسلہ وار مطالعہ کر رہے ہیں اور آج کی نشست میں اس سورۂ مبارکہ کی پچیسویں آیت زیرِ درس تھی' جس کی میں نے آغاز میں تلاوت کی ہے۔

آپ میں سے بہت سے حضرات کی نگاہوں سے شاید آج اخبارات میں وہ اشتہار بھی گزرا ہو جس میں اس درس سے متعلق مَیں نے تین سوالات معیّن کیے تھے۔ پہلا یہ کہ ''اسلام صرف تبلیغی مذہب ہے یا انقلابی دین؟'' دوسرے یہ کہ ''اسلامی انقلاب کا اصل ہدف کیا ہے؟'' اور تیسرا یہ کہ ''کیا اسلامی انقلاب کے لیے طاقت کا استعمال جائز ہے؟'' —— انہی تین سوالات کے حوالے سے میں اس وقت سیرت النبی علیٰ صاحبہا والصلوٰۃ والسلام کے ضمن میں کچھ عرض کروں گا۔ باقی جہاں تک آپ کے مقرّر کردہ موضوع کا تعلق ہے' اس سے اس کا بالکل واضح تعلق یہ ہے کہ حبِ رسولؐ کا اصل تقاضا ہے اتباعِ رسول ﷺ —— اپنی اس بات کی تاکید وتائید کے لیے میں نے آغاز میں سورۂ آل عمران کی آیت ۳۱ بھی تلاوت کی تھی جس سے ہمارے دین میں اتباعِ رسول کی جو اہمیت ہے وہ نہایت وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

''(اے نبی ﷺ! اہلِ ایمان سے) کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو (میری راہ پر چلو) تا کہ اللہ تم سے محبت کرے اور تمہارے گناہوں کو بخش دے' اور اللہ ہے ہی بخشنے والا' رحم فرمانے والا۔''

حُبِّ رسول کا تقاضا: اتّباعِ رسول

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ دو اہم الفاظ ایسے ہیں جو اللہ کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی۔ پہلا لفظ ہے اطاعت اور دوسرا ہے محبت۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ —— اسی طرح محبت کا لفظ اللہ کے لیے بھی آتا ہے اور رسولؐ کے لیے بھی۔ جیسے سورۃ التوبۃ کی آیت ۲۴ میں فرمایا:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

”(اے نبی ﷺ! ان مدعیانِ ایمان سے) کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں اپنے باپ اور اپنے بیٹے اور اپنے بھائی اور اپنی بیویاں اور اپنے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے کمائے ہیں اور جمع کیے ہیں اور اپنے وہ کاروبار جو تم نے بڑی مشقّت سے جمائے ہیں اور جس میں تمہیں کساد کا اور مندے کا خوف رہتا ہے اور اپنی وہ بلڈنگیں جو تم نے بڑے ارمانوں کے ساتھ تعمیر کی ہیں جو تمہیں بڑی بھلی لگتی ہیں، اگر یہ چیزیں تمہیں محبوب تر ہیں اللہ سے اور اس کے رسول (ﷺ) سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تو جاؤ انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے، اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

تو یہاں اللہ کی محبت کے ساتھ ہی رسول کی محبت کا ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی جہاد فی سبیل اللہ کی محبت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

اب میری بات کو غور سے سماعت فرمایئے۔ جب اللہ کی اطاعت اور اللہ کی محبت دونوں کو جمع کریں گے تو اس کا جو حاصلِ جمع ہوگا اس کا نام ”عبادت“ ہے۔ عبادت صرف اللہ کی ہے، رسول کی نہیں ہے۔ اور جب رسول کی اطاعت اور رسول کی محبت کو جمع کریں گے تو اس کے حاصل جمع کو عبادت نہیں کہا جائے گا بلکہ ”اتباع“ کہا جائے گا۔

عبادت کا اصل مفہوم ہے: ”انتہائی محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اللہ کی بندگی اور

پرستش کرنا‘‘ اور اتّباع کا مفہوم ہے: ’’محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر پیروی کرنا‘‘۔
اطاعت اور اتباع میں کیا فرق ہے‘ اس کو بھی سمجھ لیجیے۔ اطاعت کی جاتی ہے کسی کے حکم کی‘ جبکہ اتّباع یہ ہے کہ کسی ہستی سے اتنی محبت ہو جائے کہ چاہے اس نے حکم نہ دیا ہو لیکن اس ہستی کے ہر عمل اور فعل کی پیروی کرنا۔ گویا بقولِ شاعر ؎

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں　　　خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں!

تو اتباع کا درجہ اطاعت سے بہت بلند ہے اور اس کے مفہوم میں بہت وسعت ہے۔ اطاعت میں صرف حکم پیش نظر ہوگا اور اتباع میں نبی اکرم ﷺ کے ہر ہر عمل اور فعل کو بلکہ ہر ہر ادا کی پیروی کو سعادت سمجھا جائے گا چاہے آپؐ نے اس کا حکم نہ دیا ہو۔ حاصل گفتگو یہ کہ حبِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تقاضا ہے اتباعِ رسول ﷺ۔

اتباعِ رسولؐ کا ایک اہم پہلو

اسی اتباعِ رسول کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ہم اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ بحیثیت مجموعی حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا رُخ کیا تھا! آپؐ نے کس کام کے لیے محنت کی! آپؐ کو کیا فکر دامن گیر تھی! آپؐ نے اپنی دن رات کی سعی و کوشش اور محنت و مشقّت کا ہدف کیا معیّن فرمایا! — اس دنیا میں ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے لیے کوئی نہ کوئی ہدف معیّن کرتا ہے‘ پھر اس کی ساری محنت اور بھاگ دوڑ اسی رخ پر ہوتی ہے۔ کوئی اپنے پیشے (profession) میں اعلیٰ سے اعلیٰ مہارت حاصل کرنے کے لیے اور اپنا مقام بنانے کے لیے محنت اور سعی و جُہد کرتا ہے۔ کوئی سیاست دان ہے‘ اس کا بھی ایک ہدف ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ حکومت کے کسی منصب پر فائز ہو‘ اقتدار اس کے ہاتھ میں یا اس کی پارٹی کے ہاتھ میں آئے۔ کاروباری آدمی ہے تو اس کا بھی ایک ہدف ہے‘ وہ محنت کر رہا ہے‘ مشقت کر رہا ہے‘ راتوں کو جاگ رہا ہے‘ کہاں کہاں سے سامانِ تجارت منگاتا اور کہاں کہاں بھیجتا ہے! دنیا بھر کی مارکیٹوں مین چیزوں کے نرخوں کے اتار چڑھاؤ‘ کمی بیشی کی خبر رکھتا ہے۔ یہ ساری سوچ اس کے ہدف کے تابع ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ کی سعی و جُہد کا ہدف!

اب سوال یہ ہے کہ جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے جو انتہائی جاں گسل محنت و مشقت کی

زندگی بسر کی تو اس کا ہدف کیا تھا؟ جو شخص سیرتِ مطہّرہ کا سَرسَری سا بھی مطالعہ کرتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ وہ حیران رہ جاتا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے مشن کے لیے کتنی محنت کی ہے اور کتنی مشقت جھیلی ہے۔ ہم اگر حضور ﷺ کا اتباع کرنے کے خواہشمند ہیں تو ہمارے لیے سب سے اہم بات یہ طے کرنے کی ہوگی کہ حضور ﷺ کی زندگی کا رُخ کیا تھا! آپؐ کے سامنے کیا مقصد تھا! کس ہدف کے حصول کے لیے آپؐ نے سعی و جُہد فرمائی تھی! اس کے ضمن میں ایک اور بات بھی سامنے رکھئے کہ اگر خود آپ کا ایک مقصد معیّن ہے تو اس کے حصول کے لیے آپ کوئی کام کرنے پڑتے ہیں۔ آپ اگر ان کئی کاموں کو علیحدہ علیحدہ (isolate) کر کے دیکھیں گے تو وہ آپ کو مختلف نظر آئیں گے‘ ان میں بظاہر ربط نظر نہیں آتا‘ لیکن دراصل ان کو باہم مربوط کرنے والا ’’ایک مقصد‘‘ ہوتا ہے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھیں تو وہ تمام افعال جو بظاہر مختلف اور متضاد معلوم ہوتے ہیں‘ وہ سب کے سب مربوط نظر آئیں گے اور درحقیقت ان کا باہمی ربط اس وقت تک قائم کرنا مشکل ہوگا جب تک واضح طور پر ’’مقصد‘‘ سامنے نہ ہو۔ ان بظاہر مختلف ومتضاد افعال میں باہمی ربط وتوافق تب ہی نظر آئے گا اور قائم ہو سکے گا جب مقصد معین طور پر سامنے موجود ہوگا۔

ہدف کی تعین کی اہمیت

اس مسئلہ کی اہمیت میں آپ حضرات کے سامنے واضح کر دوں کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں بعض پہلو بظاہر متضاد نظر آتے ہیں‘ اور یہ تضادات اسی صورت میں حل ہو سکتے ہیں جب حضور ﷺ کی زندگی کا ہدف اور مشن ہمارے سامنے ہو۔ دشمنانِ اسلام خاص طور پر مستشرقین نے ان پر اعتراضات بھی کیے ہیں اور حملے بھی۔ میں ان میں سے چند کا بطورِ مثال ذکر کرتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ مکّہ میں نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سخت ترین مصیبتیں جھیل رہے ہیں‘ حضورؐ کے ساتھیوں کو دہکتے انگاروں پر لٹایا جا رہا ہے‘ مکہ کی سنگلاخ اور تپتی ہوئی زمین پر گردن میں رسّی ڈال کر جانوروں کی لاش کی طرح گھسیٹا جا رہا ہے۔ ایک مؤمنہ کو نہایت بہیمانہ ہی نہیں بلکہ انتہائی کمینگی سے شہید کیا جا رہا ہے۔ ایک مؤمن کے ہاتھ پاؤں چار اونٹوں سے باندھ کر ان اونٹوں کو چار سمت میں ہانک دیا جاتا ہے کہ جسم کے چیتھڑے اڑ جاتے ہیں‘ لیکن جوابی کارروائی کی اجازت نہیں ہے۔ مکّہ میں

بارہ برس تک حضور ﷺ کے کسی جاں نثار نے مشرکینِ مکہ کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی‘ کوئی بدلہ نہیں لیا۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کا فرمان تھا کہ اپنے ہاتھ باندھے رکھو! کوئی جوابی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ حالانکہ مکہ میں جو حضراتِ گرامی دولت ایمان سے مالا مال ہوئے تھے ان میں سے ہر ایک شجاعت و بہادری میں اگر ایک ایک ہزار کے برابر نہیں تو ایک ایک سو کے برابر ضرور تھا‘ اور ان کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ تھی۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کے حکم ”كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ“ کی تعمیل میں کسی نے اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ ایک طرف یہ انتہا ہے‘ دوسری طرف مدنی دَور میں حضور ﷺ کے ہاتھ میں تلوار ہے‘ عَلم ہے۔ آپؐ کے جاں نثار اصحاب (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے ہاتھوں میں تلواریں ہیں‘ نیزے ہیں‘ تیر کمان ہیں۔ جوابی کارروائی ہو رہی ہے‘ بلکہ جیسا کہ میں ”منہجِ انقلابِ نبویؐ“ کے موضوع پر اپنی مسلسل تقریروں میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں (1) کہ صرف جوابی کارروائی ہی نہیں بلکہ ہجرت کے بعد حضور ﷺ نے اقدام میں پہل کی ہے۔

لیکن پچھلی چند صدیوں میں جب نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمِ اسلام کے کثیر رقبہ پر مغربی سامراج کا سیاسی و عسکری استیلاء تھا اور اکثر مسلم ممالک کسی نہ کسی مغربی طاقت کے غلام تھے‘ حکمران اقوام کی طرف سے اسلام پر بڑے شدید اعتراضات کیے گئے کہ اسلام بڑا خونخوار مذہب ہے‘ مسلمان بڑی خونی قوم ہے اور اسلام تو تلوار کے زور پر پھیلا ہے ؎ ”بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے“۔ اغیار نے ہم پر یہ تہمت اس شدّ و مدّ سے لگائی کہ علامہ شبلی مرحوم جیسے عالمِ دین‘ سیرت نگار‘ مؤرخ نے بھی معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا اور سیرت کی پہلی جلد میں لکھ دیا کہ نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اقدام میں نہ پہل کی اور نہ تلوار اٹھائی‘ بلکہ تلوار اگر اٹھائی تو مجبوراً اور اپنی مدافعت میں اٹھائی۔ علامہ شبلی مرحوم تو پھر بھی اس معاملے میں قابلِ عفو قرار دیے جا سکتے ہیں کہ ان کا دَور وہ تھا جب انگریز کی حکومت تھی‘ اس کا غلبہ تھا۔ لیکن مجھے نہایت حیرت اور افسوس اس بات پر ہے‘ اور یہ بات قابل اعتبار ذرائع سے میرے علم میں آئی ہے کہ حال ہی میں ایک دینی

(1) الحمد للہ اس موضوع پر ”منہجِ انقلابِ نبویؐ“ کے نام سے محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے دس خطابات کتابی شکل میں موجود ہیں۔

جماعت کے پلیٹ فارم سے ایک نامور عالمِ دین کی طرف سے پاکستان کی آزاد فضا میں یہ کہا گیا ہے کہ ''اسلام میں کوئی جارحانہ جنگ نہیں ہے' بلکہ صرف مدافعانہ جنگ ہے۔ حضور ﷺ اور خلافتِ راشدہ کے دَور میں جتنی جنگیں ہوئی ہیں وہ صرف دفاعی جنگیں تھیں''۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

ضمنی طور پر یہ مسئلہ زیر گفتگو آ گیا ہے تو ایک اہم اور اصولی بات عرض کر دوں کہ تصادم کا آغاز اصولاً داعیٔ انقلاب کرتا ہے' اقدام اُس کی جانب سے ہوتا ہے۔ آپ حضرات غور کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز کہاں سے فرمایا! آپؐ نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی اور گلی گلی صدا بلند فرمائی: ((یَا اَیُّھَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوْا)) (مسند احمد)۔ اس دعوت کے مضمرات اور مفہوم پر غور کیجیے' حضور ﷺ فرما رہے ہیں کہ تمہارا مذہب غلط ہے اور اس مشرکانہ مذہب پر قائم شدہ تمہارا نظام فاسد ہے۔ یہ صدیوں سے قائم ورائج نظام کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے یا نہیں؟ مکہ کی پُرامن فضا میں نعرۂ بغاوت کس نے بلند کیا؟ پُرسکون شہری زندگی کے تالاب میں پتھر کس نے پھینکا کہ پورے تالاب میں ارتعاش کی لہریں اٹھ گئیں!

اب اصل گفتگو کی طرف آیئے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ ہجرت کے بعد مکہ والوں کے خلاف اقدام میں پہل حضور ﷺ کی طرف سے ہوئی ہے۔ ہجرت کے بعد پہلے چھ مہینے حضور ﷺ نے داخلی استحکام میں صَرف فرمائے۔ اس کے بعد آپؐ نے غزوۂ بدر سے قبل آٹھ چھاپہ مار دستے بھیجے جن میں سے چار میں آپؐ خود سپہ سالار تھے۔ ان مہموں کے دو مقصد تھے۔ پہلا مقصد تھا قریش مکہ کے قافلوں کے راستوں کو مخدوش بنانا جو قریش کی معاشی زندگی کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسے موجودہ دَور کی اصطلاح میں قریش کا ''economic blockade'' کہا جائے گا۔ دوسرا مقصد تھا قریش کی سیاسی ناکہ بندی' جو آج کی اصطلاح میں ''political isolation & containment of Quraish'' کہلائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے مکّہ اور مدینہ منورہ کے مابین بسنے والے بعض قبیلوں کو اپنا حلیف بنا لیا اور بعض کو غیر جانب دار کہ وہ جنگ کی صورت میں نہ حضور ﷺ کا ساتھ دیں گے نہ قریش کا۔ انہی مہموں میں سے ایک مہم عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں وادیٔ

نخلہ بھیجی۔ یہ وادی طائف اور مکہ کے مابین واقع ہے اور اس راستے سے قریش کے تجارتی قافلے طائف سے ہو کر یمن کے ساحل تک جاتے تھے۔ حضورﷺ کی ہدایت تھی کہ قریش کی نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھو اور ہمیں خبر دیتے رہو۔ ان حضراتؓ کو لڑائی کا کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ لیکن صورتِ حال ایسی پیش آئی کہ اس دستہ کی قریش کے ایک قافلے سے مڈبھیڑ ہوگئی جو کافی مالِ تجارت اور پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ ان مشرکین میں سے ایک شخص قتل ہوا' دو افراد فرار ہوگئے' دو کو قیدی بنالیا گیا اور ان کو اور مالِ غنیمت کو لے کر یہ حضراتؓ مدینہ واپس آ گئے۔ تفاصیل کے لیے نہ موقع ہے نہ وقت۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ ہجرت کے چھ ماہ بعد آٹھ مہمات کی صورت میں اقدام کی پہل نبی اکرمﷺ کی طرف سے ہوئی اور پہلا مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

مزید برآں یہ بات تو ساری دنیا کو معلوم ہے کہ حضورﷺ نے مدینہ تشریف لانے کے بعد متعدد جنگیں لڑی ہیں۔ جیسے قرآن مجید میں نقشہ کھینچا گیا ہے: ﴿يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ﴾ (التوبة: ۱۱۱) ''اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں' پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں''۔ تو مکی زندگی اور مدنی زندگی کا فرق آپ کے سامنے ہے۔ ان میں بظاہر بہت بڑا تضاد موجود ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مشہور مؤرخ ٹائن بی (۱۸۸۹ء تا ۱۹۷۵ء) جسے اس دور میں فلسفہ تاریخ میں اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے' اس نے ایک جملے میں پورا زہر بھر دیا ہے۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔ وہ کہتا ہے:

"Muhammad failed as a Prophet but succeeded as a statesman"

اس کے اس جملہ کی زہرناکی کو آپ نے محسوس کیا! وہ یہ کہہ رہا ہے کہ مکہ میں محمد (ﷺ) کی زندگی تو نبیوں کے مشابہ ہے۔ دعوت ہے' تبلیغ ہے' وعظ ہے' نصیحت ہے' تلقین ہے' انذار ہے' تبشیر ہے' صبر ہے' پتھراؤ ہو رہا ہے' لیکن جوابی کارروائی نہیں ہو رہی ہے۔ عیسائیوں کے جو آئیڈیل ہیں یعنی حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام' ان کی زندگی کا نقشہ یہی تو تھا! حضرت مسیحؑ نے تلوار تو کبھی نہیں اٹھائی! آپؑ کبھی کسی حکومت کے سربراہ تو نہیں بنے! حضرت یحییٰؑ کے ہاتھ میں بھی کبھی تلوار نہیں آئی! تو ٹائن بی کے نزدیک مکہ میں حضورﷺ

کی جو سیرت نظر آتی ہے وہ نبوت کے نقشہ پر کچھ نہ کچھ پوری اترتی ہے۔ وہ اگرچہ حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق نہیں کرتا لیکن یہ مانتا ہے کہ سیرت کا مکہ میں جو نقشہ ہے وہ نبیوں کی سیرت و زندگی سے مشابہ ہے‘ لیکن اس کے کہنے کے مطابق وہاں حضور ﷺ ناکام ہو گئے۔ نعوذ باللّٰہ منْ ذٰلک۔ وہاں سے تو جان بچا کر نکلنا پڑا۔ البتہ اسے مدینہ میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ بالکل ایک نئی شکل میں نظر آتے ہیں۔ سپہ سالار ہیں‘ شہسوار ہیں‘ صدرِ مملکت ہیں‘ مدینہ کی شہری ریاست کے سربراہ ہیں‘ آپؐ ہی چیف جسٹس ہیں‘ مقدمات آ رہے ہیں اور آپؐ فیصلے صادر فرما رہے ہیں۔ معاہدے کر رہے ہیں‘ مدینہ آتے ہی یہود کے تینوں قبیلوں کو معاہدہ میں جکڑ لیا ہے‘ عرب کے دوسرے قبائل سے معاہدے ہو رہے ہیں۔ تو وہ کہتا ہے کہ یہ صورت تو ایک سیاستدان (statesmam) کی نظر آتی ہے۔ اس میں پیغمبرانہ شان اسے نظر نہیں آتی۔ اس کا کہنا ہے کہ سیاست دان کی حیثیت سے محمد ﷺ کامیاب ہو گئے‘ ان کی کامیابی بحیثیت پیغمبر نہیں تھی۔

اسی ایک جملہ کی شرح ہے جو ایک برطانوی مؤرخ مسٹر منٹگمری واٹ (۱۹۰۹ء تا ۲۰۰۶ء) نے ایک دوسرے انداز سے کی ہے۔ آپ حضرات نے نام سن رکھا ہو گا۔ مرکزی حکومت کے زیر اہتمام اسلام آباد میں ہر سال جو سیرت کانفرنس ہوتی ہے تو چند سال قبل مسٹر واٹ کو حکومت کی طرف سے مدعو کیا گیا تھا کہ وہ آ کر ہمیں سیرتِ مطہرہ سمجھائے۔ اس شخص نے سیرت پر دو کتابیں علیحدہ علیحدہ لکھی ہیں۔ ایک کا نام ہے ''Muhammad at Mecca'' اور دوسری کا نام ہے ''Muhammad at Medina'' (ﷺ) اس نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو دو حصوں میں بانٹ کر دراصل اس ظاہری تضاد کو نمایاں کرتے ہوئے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مکہ والے محمد (ﷺ) اور ہیں جبکہ مدینہ والے محمد (ﷺ) اور ہیں۔ میں نے یہ مثال اس لیے دی ہے کہ کسی نہ کسی درجہ میں اور بظاہر تضاد واقعتاً نظر آتا ہے۔ دشمنوں نے اسے exploit کیا اور اسے تنقید و تنقیص کا موضوع بنا لیا۔ لیکن ہمیں بھی یہ ماننا پڑے گا کہ دو رنگ جدا ہیں۔ میں بعد میں وضاحت کروں گا کہ ان کا آپس میں ربط کیا ہے۔

اب دوسری نمایاں مثال میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ آپ سب نے پڑھ رکھا

ہوگا اور سن رکھا ہوگا کہ ٦ ھ میں حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ اور قریش مکہ کے مابین صلح کا ایک معاہدہ ہوا تھا جو صلح حدیبیہ کے نام سے سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ اس صلح کی شرائط بڑی حد تک یک طرفہ نظر آتی ہیں اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے دب کر صلح کی ہے۔ یہاں تک کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انتہائی مضطرب اور بے چین تھے کہ دب کر کیوں صلح کی جا رہی ہے! ہم اتنے کمزور تو نہیں، ہم حق پر ہیں، ہم حق کے لیے جانیں دینے کے لیے تیار ہیں۔ چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موت پر بیعت کر چکے تھے، سب حضور ﷺ کے دستِ مبارک پر عہد کر چکے تھے کہ ہم سب یہاں جانیں دے دیں گے، پیٹھ نہیں موڑیں گے۔ پھر ہم دب کر صلح کیوں کر رہے ہیں؟ صلح کی شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ واپس جاؤ، احرام کھول دو، اس دفعہ عمرہ کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اوّل تو یہی بات صحابہ کرامؓ کے لیے ناممکن القبول تھی۔ احرام باندھ کر آئے تھے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ میں اضطراب پیدا ہوا کہ عمرہ کیے بغیر احرام کیسے کھول دیں! پھر ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر مکہ کا کوئی شخص اپنے ولی اور سرپرست کی اجازت کے بغیر مدینہ جائے گا (یعنی اسلام قبول کر کے جائے گا) تو مسلمانوں کو اسے واپس کرنا ہوگا، لیکن اگر کوئی شخص مدینہ سے اسلام چھوڑ کر (مرتد ہو کر) مکّہ آجائے گا تو اسے قریش واپس نہیں کریں گے۔ بظاہر بڑی غیر منصفانہ بات تھی۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے جز بز ہوئے، ان کے جذبات میں جوش و ہیجان پیدا ہوا کہ یہ صلح تو مساوی شرائط پر نہیں ہو رہی۔

چنانچہ جب صلح نامہ پر دستخط کے بعد نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ احرام کھول دیے جائیں اور قربانی کے جو جانور ساتھ ہیں ان کی یہیں قربانی دے دی جائے تو اس وقت صحابہ کرامؓ کے جذبات کا عالَم یہ تھا کہ کوئی نہیں اٹھا۔ کیفیت یہ تھی کہ گویا اعصاب اور اعضاء شل ہو گئے ہیں۔ سب ہی دل شکستہ تھے۔ حضور ﷺ نے دو مرتبہ پھر فرمایا کہ احرام کھول دیے جائیں اور قربانیاں دے دی جائیں، لیکن پھر بھی کوئی نہیں اٹھا۔ حضور ﷺ ملول اور رنجیدہ ہو کر خیمہ میں تشریف لے گئے۔ عام معمول یہ تھا کہ سفر میں حضور ﷺ کے ساتھ کوئی نہ کوئی زوجہ محترمہؓ ہوتی تھیں۔ چنانچہ اس سفر میں حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا آپؐ کے ساتھ تھیں۔ حضور ﷺ نے ان سے ذکر فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور! آپ کسی سے کچھ نہ

کہئے، بس آپؐ قربانی دے دیجیے اور احرام کھول دیجیے۔ حضور ﷺ باہر تشریف لائے، قربانی دی اور حجام کو بلایا کہ میرے سر کے بال مُونڈ دو اور آپؐ نے احرام کھول دیا۔ صحابہ کرامؓ نے جب یہ دیکھا تو اب سب کے سب کھڑے ہو گئے۔ جو صحابہ قربانی کے جانور ساتھ لائے تھے انہوں نے قربانیاں دیں اور تمام صحابہ کرامؓ نے حلق یا قصر کرا کے احرام کھول دیے۔ اس صورتِ حال کی تاویل اور توجیہہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ پر اُس وقت انتظار کی سی حالت طاری تھی، وہ اس خیال میں تھے کہ شاید کوئی نئی شکل پیدا ہو جائے، شاید نئی وحی آ جائے۔ لیکن جب حضور ﷺ نے احرام کھول دیا تو حالتِ منتظرہ ختم ہو گئی اور سب نے حکم کی تعمیل کی، ورنہ معاذ اللہ ہم صحابہ کرامؓ کے متعلق ہرگز کسی حکم عدولی کا گمان تک نہیں کر سکتے۔ میں نے یہ سارا پس منظر آپ حضرات کے سامنے قدرے تفصیل سے اس لیے رکھا ہے کہ آپ صحیح اندازہ کر سکیں کہ ۶ھ میں حدیبیہ کے مقام پر جو صلح کا معاہدہ ہوا اس کی شرائط واقعتاً غیر مساوی تھیں اور حضور اکرم ﷺ بظاہر دب کر صلح فرما رہے تھے۔ گویا اُس وقت آپؐ بہر صورت صلح کرنا چاہتے تھے۔

لیکن دو سال بعد جب ایک موقع پر قریش نے معاہدے کی ایک شق کی خلاف ورزی کی، اور جب حضور ﷺ نے اس خلاف ورزی پر ان کی گرفت فرمائی تو قریشِ مکہ نے خود صلح کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ تب ابوسفیان کو، جو اُس وقت پورے قریش کے قبیلہ کی سرداری کے منصب پر فائز تھے، یہ احساس ہوا کہ جذبات میں آ کر ہم سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے، یہ صلح تو ہمارے تحفظ (protection) کی حامل تھی، اس صلح کی تجدید ہونی چاہیے۔ چنانچہ ابوسفیان خود چل کر مدینہ پہنچے، سر توڑ کوششیں کیں، سفارشیں ڈھونڈیں کہ کسی طرح حضور ﷺ صلح کی تجدید کی منظوری دے دیں۔ لیکن بارگاہِ رسالت سے ابوسفیان کی صلح کی تجدید کے لیے کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔ نبی اکرم ﷺ نے سکوت اختیار فرمایا اور صلح کی تجدید کی حامی نہیں بھری۔ غور کیجیے، یہاں بھی بظاہر ایک بڑا تضاد نظر آتا ہے۔ دو سال پہلے بظاہر دب کر صلح کر رہے ہیں اور دو سال بعد قریش کے سردار کی طرف سے صلح کی درخواست ہو رہی ہے اور اس مقصد کے لیے وہ خود مدینہ آیا ہے لیکن حضور ﷺ صلح نہیں فرما رہے۔

اب یہ جو ظاہری تضادات نظر آ رہے ہیں ان کے مابین ربط قائم کرنا ہو گا۔ لیکن یہ

ربط کس چیز کے ذریعے قائم ہوگا؟ یہ ربط قائم ہوگا نبی اکرم ﷺ کے اصل ہدف اور مقصود کی تعیین سے‘ جس کے لیے آغازِ نبوت سے مسلسل جدّوجُہد ہو رہی ہے۔ تو جان لیجیے کہ یہ ہدف اور یہ مقصود و مطلوب ہے: ’’اللہ کے دین کو غالب کرنا‘‘۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے ایک وقت میں ہاتھ روکنے کا حکم ہے‘ مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے‘ جبکہ ایک وقت میں ہاتھ کھولنے اور اقدام کرنے کا حکم ہے۔ ایک وقت میں اسی مقصد کے لیے صلح مفید ہے‘ لہٰذا صلح کی جا رہی ہے‘ اپنی انانیت کو آڑے آنے نہیں دیا جا رہا‘ دب کر اور کسی قدر شکست خوردگی کے انداز میں صلح کی جا رہی ہے اور ایک وقت میں اس مقصد کی خاطر جب صلح نہ کرنا مفید ہے تب صلح نہیں کی جا رہی ہے۔ تمام تضادات درحقیقت مقصد کو صحیح طور پر سمجھ لینے ہی سے رفع ہوتے ہیں۔ مستشرقین نے دراصل جو ٹھوکر کھائی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے رسولوں کی بعثت کے بنیادی مقصد ہی کو نہیں سمجھا۔

رسولوں کو بھیجنے کا مقصد

قرآن مجید میں رسولوں کی بعثت کا بنیادی مقصد سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں بیان فرمایا گیا ہے: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ﴾ ’’بلاشبہ بالتحقیق ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو بیّنات کے ساتھ‘‘۔ یعنی واضح تعلیمات اور واضح نشانیاں دے کر۔ ﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾ ’’اور ہم نے ان رسولوں کے ساتھ کتاب بھی نازل فرمائی اور میزان بھی‘‘۔ یہ سب کس لیے کیا! رسول کیوں بھیجے! کتاب اور میزان کس لیے نازل فرمائی! اس مقصد کو آیت کے اگلے حصہ میں معیّن فرمایا گیا: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ’’تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم ہوں‘‘۔ گویا رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجنے اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان یعنی شریعت نازل فرمانے کی غایت اور مقصد بیان فرما دیا گیا: تاکہ لوگ عدل وقسط پر قائم ہوں۔ ظلم کا خاتمہ ہو جائے‘ جبر اور استبداد کا خاتمہ ہو جائے اور استحصال کا قلع قمع ہو جائے۔ لیکن یہ نظامِ عدل کون سا ہوگا؟ ایک عدل کا نظام وہ ہے جو انسان اپنے ذہن سے بناتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کوئی System of Social Justice وجود میں آ جائے۔ چنانچہ نظامِ عدلِ اجتماعی کا ایک تصور وہ ہے جو کمیونسٹوں کے ہاں ملتا ہے‘ جبکہ ایک تصور مغربی ممالک کا ہے۔ کوشش سب کی یہ ہے کہ ہم کسی حقیقی نظامِ عدلِ اجتماعی تک پہنچ

جائیں، لیکن انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے جتنے تصورات ہیں ان میں کسی نہ کسی پہلو سے کوئی نقص یا خامی رہ جاتی ہے۔ حقیقی نظامِ عدلِ اجتماعی صرف وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے ذریعے سے نوعِ انسانی کو عطا فرماتا ہے، جسے ہم دین وشریعت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اللہ کے آخری نبی اور رسول محمد ﷺ پر اس شریعت کی تکمیل ہوگئی ہے۔ یہ نظام جس نے ہر ایک کے فرائض اور حقوق کا صحیح صحیح تعین کر دیا ہے۔ جس نے طے کر دیا ہے کہ کس کو کیا دیا جائے گا اور کس سے کیا وصول کیا جائے گا۔ جس نے معاشرے کے تمام طبقات کے حقوق وفرائض کا تعین نہایت متوازن اور فطری انداز میں کیا ہے اور جس نے ہر شعبۂ زندگی کا احاطہ کیا ہے، جس میں معاشرت بھی ہے اور سیاست بھی، تجارت بھی ہے اور معیشت بھی۔ جان لیجیے کہ اس نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنا انبیاء کی بعثت کا ایک اہم مقصد رہا ہے اور یہ ہے وہ بات جو سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں بیان ہوئی ہے۔

اب ذرا اس پہلو پر غور کیجیے کہ اس نظامِ عدل وقسط کے قیام میں رکاوٹ کون بنے گا؟ ظاہر بات ہے کہ جو مظلوم ہیں وہ تو چاہیں گے کہ ظلم کا خاتمہ ہو، جو مستضعفین ہیں، جنہیں دبا لیا گیا ہے، جن کے حقوق غصب کیے گئے ہیں وہ تو چاہیں گے کہ ظالمانہ نظام ختم ہو جائے اور عادلانہ نظام قائم ہو۔ لیکن جو ظالم ہیں، جنہوں نے ناجائز طور پر اپنی حکومتوں کے قلادے لوگوں کی گردنوں پر رکھے ہوئے ہیں، جنہوں نے دولت کی تقسیم کا ایک غیر منصفانہ نظام قائم کیا ہوا ہے جس کے باعث ان کے پاس دولت کے انبار جمع ہو رہے ہیں چاہے دوسروں کو دو وقت کی روٹی بھی نہ مل رہی ہو، کیا وہ کبھی پسند کریں گے کہ استحصالی وظالمانہ نظام ختم ہو جائے اور عدل وقسط کا نظام قائم ہو؟ شریعتِ خداوندی ومیزانِ عدل نصب ہو جائے! ان کی عظیم اکثریت یہ تبدیلی بالکل پسند نہیں کرے گی۔ لیکن ان طبقات میں بھی کچھ سلیم الطبع لوگ ہوتے ہیں جو بیدار ہو جاتے ہیں، ان کو احساس ہو جاتا ہے کہ واقعی یہ نظام غلط ہے، باطل ہے۔ چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ کے نتیجہ میں خود آلِ فرعون میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئے تھے۔ قرآن حکیم میں ایک مؤمنِ آلِ فرعون کا ذکر موجود ہے۔ سورۃ المؤمن میں ان کی پوری تقریر نقل کی گئی ہے، جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: ﴿وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ﴾ (آیت ۲۸) یہ

صاحب جو آلِ فرعون کے اہم سرداروں میں سے تھے' فرعون کے دربار میں ان کا اونچا مقام تھا' ایمان لے آئے تھے! یہ اس لیے ہوا کہ ان کی انسانیت بیدار تھی۔ معلوم ہوا کہ ظالم اور استحصالی طبقات میں بھی کچھ سلیم الفطرت لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب حق کی دعوت ان کے سامنے آتی ہے تو اسے قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد ہمیشہ آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے' جبکہ عظیم اکثریت انہی لوگوں کی ہوتی ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ حالات جوں کے توں (status quo) رہیں' تاکہ ان کے مفادات اور منفعتوں پر کوئی آنچ نہ آئے۔ جاگیرداری نظام ہے تو جاگیردار کبھی پسند نہیں کرے گا کہ وہ نظام ختم ہو جائے۔ سرمایہ دارانہ نظام ہے تو سرمایہ دار کبھی نہیں چاہے گا کہ وہ نظام ختم ہو جائے۔ ہندو معاشرے میں برہمن کبھی پسند نہیں کرے گا کہ ذات پات کی اونچ نیچ ختم ہو جائے۔ برہمن کو جو اونچا مقام ملا ہوا ہے کیا وہ چاہے گا کہ شودر کو اس کے برابر بنا دیا جائے؟ لہٰذا چاہے سماجی ظلم ہو' چاہے معاشی ظلم ہو اور چاہے سیاسی ظلم ہو' ظالم طبقات کی عظیم اکثریت اپنے اس ظالمانہ نظام کی مدافعت اور محافظت (protection) کے لیے میدان میں آ جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سورۃ الحدید کی اس آیتِ مبارکہ کے اگلے ٹکڑے میں فرما دیا گیا: ﴿وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡهِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ﴾ ایسے لوگوں کی سرکوبی اور علاج کے لیے ہم نے لوہا بھی اتارا ہے۔ لوہے میں جنگ کی صلاحیت ہے' اس سے اسلحہ بنتا ہے۔ لوگوں کے لیے اس لوہے میں دیگر تمدّنی فائدے بھی ہیں۔ لیکن اس آیت کی رو سے لوہے کا اصل مقصد یہ ہے کہ میزانِ خداوندی کے نصب کرنے کے مشن میں جو لوگ بھی رسولوں کے اعوان و انصار بنیں اور نظامِ عدل و قسط کے قیام کے لیے تن من دھن لگانے کے لیے تیار ہو جائیں' وہ حسبِ ضرورت اور حسبِ موقع اس لوہے کی طاقت کو استعمال کریں اور ان لوگوں کی سرکوبی کریں جو اِس راہ میں مزاحم ہوں۔ چنانچہ اسی آیت مبارکہ کے اگلے حصہ میں اس کو اللہ تعالیٰ ایمان کی کسوٹی اور اپنی اور اپنے رسولوں کی نصرت قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَلِیَعۡلَمَ اللّٰهُ مَنۡ یَّنۡصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ﴾ یعنی اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ہیں اس کے وفادار بندے جو غیب میں رہتے ہوئے اللہ کے دین کی اقامت کے لیے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں۔ یہ آیتِ مبارکہ ختم ہوتی ہے ان الفاظ مبارکہ پر: ﴿اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ

عَزِیۡزٌ ﴿۲۵﴾ ''بے شک اللہ قوی ہے' زور آور ہے' زبردست اور غالب ہے''۔ یعنی لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اللہ کی راہ میں محنت کرنے اور اللہ کی نازل کردہ میزانِ شریعت کو نصب کرنے کی تعلیم وہدایت اس لیے نہیں دی جا رہی کہ معاذ اللہ' وہ تمہاری مدد کا محتاج ہے' اُس القوی العزیز کو تمہاری مدد کی کیا حاجت! البتہ تمہاری وفاداری اور ایمان کا امتحان مقصود ہے۔ سورۃ الحدید کی یہ آیت قرآن مجید کی بڑی انقلابی آیت ہے اور اس میں عمومی اسلوب وانداز میں ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر رسولوں کی بعثت کا مقصد' ان کو کتاب ومیزان دینے کی غایت اور لوہے کے نزول کا سبب بیان ہوا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت: غلبۂ دین

یہی بات اور یہی مضمون' معیّن طور پر جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے امتیازی مقصد کے ذکر میں قرآن حکیم میں تین جگہ یعنی سورۃ التوبہ' سورۃ الفتح اور سورۃ الصّف میں فرمایا گیا۔ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ﴾ ''وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو'' (اب یہاں واحد کا صیغہ آیا رسول' جبکہ سورۃ الحدید میں آیا تھا: ﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا﴾ وہاں رُسل جمع کا صیغہ تھا) کیا دے کر بھیجا! ﴿بِالۡهُدٰی﴾۔ پہلی چیز جو حضور ﷺ دے کر بھیجے گئے وہ ہے الھدیٰ یعنی قرآن حکیم' ابدی ہدایت نامہ۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں حاملِ اُو رحمۃٌ للعالمیں

آپ کو یاد آ گیا ہوگا کہ ٹیلی ویژن پر کبھی میرا ایک پروگرام چلتا تھا' میں نے اس کا نام خود ''الھدیٰ'' تجویز کیا تھا اور وہ اسی آیت سے ماخوذ تھا۔ لیکن حضور ﷺ کو صرف الھدیٰ نہیں دیا گیا بلکہ ایک اور چیز بھی عطا کی گئی ﴿وَدِیۡنِ الۡحَقِّ﴾ ''اور حق کا دین یا سچا دین'' بھی دیا گیا۔ یہ ہے وہ نظام' جو عدل وقسط پر مبنی ہے۔ اللہ کی طرف سے نوعِ انسانی کے لیے آخری اور مکمل شریعت! رسول اللہ ﷺ کو کیوں بھیجا گیا! حضور ﷺ کو دین حق کس لیے دیا گیا! اس امتیازی مقصد کی تعیین اِس آیت سے واضح ہوئی ہے۔ آپ غور کیجیے کہ حضور ﷺ نے دعوت بھی دی' تبلیغ بھی فرمائی' تربیت بھی دی' تزکیہ بھی کیا۔ یہ سب کچھ کیا' لیکن اس تمام جدّوجُہد (struggle) کا مقصد (goal) کیا ہے! وہ ہے ﴿لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ﴾ ''تاکہ اس دینِ حق کو (اور اس نظامِ عدل وقسط کو) پورے نظامِ اطاعت پر غالب کر دیں'' —— زندگی

کا کوئی گوشہ اس سے باہر نہ رہ جائے۔ معاشرت ہو' معیشت ہو' سیاست ہو' حکومت ہو' قانون ہو' دیوانی قانون ہو چاہے فوجداری ہو' عبادات ہوں' معاملات ہوں' صلح و جنگ ہو' ہر شے دینِ حق کے تابع ہو جائے۔ اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کو مبعوث فرمایا۔ ﷺ

اب آپ غور کیجیے کہ یہ ہے مقصدِ بعثت تمام رسولوں کا کہ نظامِ عدل وقسط قائم ہو' ظلم' ناانصافی' جبر واستبداد اور استحصال کا خاتمہ ہو جائے اور اس نظامِ عدل وقسط کے قیام کے لیے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے نازل فرمایا' اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے والے اپنے سردھڑ کی بازی لگا دیں۔ یہی مقصدِ بعثت جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا ہے جو قرآن حکیم میں تین مقامات پر بیان ہوا ہے۔ اب جبکہ حضور ﷺ کی بعثتِ خصوصی کا مقصد معیّن ہو گیا تو اللہ اور اس کے آخری نبی و رسول ﷺ پر ایمان لانے اور حضور ﷺ سے محبت کا دعویٰ کرنے کے کچھ نتائج اور تقاضے ہیں جو سامنے آتے ہیں۔ میں اب انہیں ترتیب وار آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

حضور ﷺ کی محبت اور آپؐ کے اتباع کا پہلا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ ہماری زندگی کا مقصد وہی ہو جائے جو آپؐ کی بعثت کا مقصد ہے۔ باقی تمام چیزیں اس کے تابع ہو جائیں۔ اگر مقصد یہ نہیں ہے پھر تو نقشہ ہی جدا ہو گیا۔ ہم نے زندگی کے بعض گوشوں میں حضور ﷺ کی پیروی کر لی' مثلاً آپؐ کے لباس کی' وضع قطع کی' آپؐ کے روزانہ کے معمولات کی پیروی کر لی تو اپنی جگہ ہر چیز مبارک ہے' حضور ﷺ کے نقشِ قدم کی جس طور اور جس انداز سے بھی پیروی کی جائے گی وہ نہایت مبارک ہے' لیکن بحیثیت مجموعی حضور ﷺ نے اپنی زندگی کی جدّوجُہد کا جو رُخ معین فرمایا وہ اگر ہم نے اختیار کیا نہیں تو ان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں اتباع نتیجہ خیز نہیں ہو گا۔ جیسے کہ سورۃ البقرۃ کے سترہویں رکوع میں فرمایا گیا: ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا﴾ (آیت ۱۴۸) ''ہر شخص کے سامنے کوئی ہدف ہے' کوئی مقصد ہے' جس کی طرف وہ بڑھ رہا ہے''۔ آپ حضرات نے struggle for existance کے نظریہ کا مطالعہ کیا ہو گا۔ آپ لوگ تو میڈیکل کے طلبہ ہیں' ظاہر بات ہے کہ آپ نے ڈارون کا فلسفہ پڑھا ہو گا اور آپ اس کے نظریہ survival of the fittest سے واقف ہوں گے۔ اس جہادِ

زندگانی میں ہر شخص زور لگا رہا ہے' آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے اور ہر ایک کا کوئی نہ کوئی ہدف ہے۔ تو پہلی چیز جو حضورﷺ کی محبت کے تقاضا کے طور پر سامنے آئے گی وہ یہ ہے کہ ہمارا ہدف بھی وہی ہو جائے جو حضورﷺ کا تھا۔ اس وقت اس ہدف کے لفظ سے بے اختیار میرا ذہن علامہ اقبال مرحوم کے اس مصرع کی طرف منتقل ہوا کہ ؏ ''آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!'' تیرانداز پہلے تو اپنا ایک نشانہ مقرر کرتا ہے کہ میں نے تیر مارنا کہاں ہے پھر اس کی قوت روبعمل آتی ہے۔ وہ جتنے زور کے ساتھ کمان کو کھینچ سکے گا اسی زور سے وہ تیر اپنے ہدف کی طرف جائے گا۔ علامہ نے اس مصرع میں دو چیزیں جمع کر دیں ۔ کسی تیرانداز کی جدوجہد کے ضائع اور بے نتیجہ ہونے میں ذو عوامل (factors) شامل ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ہدف (goal) معیّن نہیں۔ دوسرا یہ کہ کمان کو نیم دلانہ اور پوری قوت سے کھینچا نہیں گیا ہے' اس پر پورا زور نہیں لگایا گیا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ کوئی تیر اِدھر کو چلا گیا کوئی اُدھر کو چلا گیا۔ ضروری ہو گا کہ ہدف بھی صحیح معین ہو اور پھر پوری قوت کے ساتھ تیر چلا کر اس ٹارگٹ کو hit کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ دونوں چیزیں نہیں ہوں گی تو تیر بے کار جائے گا۔

بہرحال میں جو بات عرض کر رہا تھا وہ یہ ہے کہ حبِ رسول کا پہلا تقاضا ہے اتباعِ رسول۔ اس اتباعِ رسولؐ کی پہلی منزل یہ ہو گی کہ ہر مسلمان شعوری طور پر اپنی زندگی کا ہدف معیّن کر لے کہ میری زندگی کا مقصد' میری زندگی کا ہدف' میری بھاگ دوڑ کی منزل مقصود وہی ہے جو جناب محمدؐ رسول اللہﷺ کی تھی اور وہ ہے اللہ کے دین کا غلبہ۔ اسے ملک نصر اللہ عزیز مرحوم نے ایک بڑے سادے انداز میں شعر کا جامہ پہنایا ہے۔

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

میں نماز پڑھتا ہوں تا کہ اللہ یاد رہے' روزہ رکھتا ہوں تا کہ نفس کے مُنہ زور گھوڑے کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت مجھ میں برقرار رہے' زکوٰۃ ادا کرتا ہوں تا کہ مال کی محبت دل میں ڈیرا لگا کر نہ بیٹھ رہے' لیکن ان تمام اعمال کو ایک وحدت میں پرونے والا مقصد کیا ہے! وہ ہے اللہ کے دین کی سرفرازی' اللہ کے دین کی سربلندی۔ جس شخص کی زندگی کا ہدف یہ نہیں ہے اس کا

مطلب یہ ہے کہ یہیں سے اس کی زندگی کا کانٹا بدل گیا' اب اس کا رُخ کچھ اور ہو گیا۔ اب بعض اجزاء میں وہ حضور ﷺ کے نقشِ قدم کی پیروی کر بھی رہا ہے تو جب پٹڑی بدل گئی اور بحیثیت مجموعی حضور کا اتباع مقصود و مطلوب نہ رہا تو اب اس جزوی پیروی کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی۔ البتہ بحیثیت مجموعی اگر رخ وہی اختیار کر لیا تو اب ہر معاملہ میں حضور ﷺ کی پیروی نورٌ علیٰ نورٌ کے درجہ میں آ جائے گی۔

انقلابِ اسلامی کے لیے حضور ﷺ کا طریق کار

اب دوسری بات کو لیجیے! اس منزل کے حصول اور اس منزل تک رسائی کا راستہ کون سا ہے! یہ ہم کہاں سے معلوم کریں گے! اس معاملے میں بھی رہنمائی ہمیں سیرتِ رسولؐ ہی سے ملے گی۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ہر کام ہر طریقے پر نہیں ہو سکتا۔ ہر کام کے لیے ایک طریقہ معیّن ہے۔ گندم کاشت کرنی ہے تو اس کا ایک خاص موسم ہے' اسی میں آپ کاشت کریں گے تو آپ کو فصل ملے گی۔ ورنہ بیج بھی ضائع ہو جائے گا خواہ خلوص و اخلاص کتنا ہی ہو۔ پھر یہ کہ اس کے لیے زمین کو تیار کرنا ہو گا۔ زمین تیار نہیں کی اور آپ گندم کے بیج بکھیر آئے تو کیا فصل مل جائے گی! معلوم ہوا کہ گندم کے حصول کا ایک نہج ہے' منہج ہے' طریق کار ہے۔ اگر اس کی پیروی نہیں کریں گے تو گندم نہیں اُگے گی۔ اسی طرح اس نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنے کے لیے بھی' جو رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا' وہی طریقِ کار اختیار کرنا ہو گا جو جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے اختیار فرمایا۔ اگر ایک شخص غلط فہمی میں ایک طریقِ کار پر عمل کر رہا ہے' وہ اپنی جگہ مخلص ہے' وہ سمجھتا ہے کہ اسی طریقے سے اسلامی انقلاب آ جائے گا' اسلامی نظامِ عدل و قسط قائم ہو جائے گا تو خلوص کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر مل جائے گا' لیکن دُنیا میں اس کی محنت کامیاب نہیں ہو گی۔ لہٰذا ہمارا دوسرا شعوری فیصلہ یہ ہونا چاہیے کہ ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ حضور ﷺ نے کس طریقے سے انقلاب برپا فرمایا' کس نہج سے نظامِ عدل وقسط قائم فرمایا' کس طریقے سے ظالمانہ' استبدادی اور استحصالی نظام کو ختم کر کے ''لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ'' کی منزل تک رسائی فرمائی؟

جب ہمارا یہ شعوری فیصلہ ہو جائے گا تو اب ضرورت ہو گی کہ ہم سیرتِ طیّبہ کا گہرا مطالعہ کریں اور یہ معلوم کریں کہ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے حضور ﷺ نے کیا طریق

کار (method) اختیار فرمایا تھا۔ اس لیے کہ کسی معاشرے میں انقلاب لانے کے لیے ہر طریقہ کارگر اور مفید نہیں ہوتا' بلکہ جس قسم کی تبدیلی لانی ہو یا جس نوعیت کا انقلاب برپا کرنا مقصود ہو' اسی کی مناسبت سے طریقِ کار وضع کیا جاتا ہے۔ میں ایک مثال عرض کر دوں۔ اشتراکی انقلاب کا اپنا ایک طریقہ ہے۔ جب تک اس نظریے کے شیدائی اور کامریڈز کسی معاشرے میں طبقاتی شعور (class consciousness) پیدا نہیں کرتے کہ یہ اہلِ ثروت (haves) ہیں اور وہ محرومین (have nots)' یہ مراعات یافتہ اور استحصالی طبقات ہیں اور وہ دبے ہوئے اور پسے ہوئے طبقات ہیں۔ جب تک اس شعور کو مظلوم طبقات کے ذہنوں میں راسخ نہیں کر دیا جائے گا' اس وقت تک اشتراکی انقلاب کی راہ میں پہلا قدم بھی نہیں اٹھ سکے گا۔ پہلے یہ طبقاتی شعور (class consciousness) پیدا کرنا ہوگا۔

دوسرا مرحلہ ہوگا طبقاتی کشاکش اور تصادم (class struggle) کا۔ اب طبقات کو طبقات سے ٹکرایا جائے۔ اس کے بغیر اشتراکی انقلاب کے لیے دوسرا قدم نہیں اٹھ سکے گا۔ ان کے علاوہ اشتراکیوں کے دوسرے مختلف ہتھکنڈے ہیں' افراتفری پیدا کرنا' بدنظمی پیدا کرنا' اسی طرح علاقائی اور لسانی عصبیتوں کا پیدا کرنا کہ ہم سندھی ہیں' ہم بلوچی ہیں' ہم پختون ہیں' ہم پنجابی ہیں' ہم مہاجر ہیں۔ ہماری تہذیب علیحدہ ہے' ہماری ثقافت علیحدہ ہے' ہماری زبان علیحدہ ہے۔ اس طریقے پر ایک دوسرے کے خلاف نفرتوں اور عصبیتوں کو ابھار کر باہم ایک دوسرے سے ٹکرا دینا' یہ کمیونسٹوں کی جدید تکنیک ہے۔ اس میں بموں کے دھماکوں اور دوسری تخریب کاریوں کے ذریعے سے چاہے بوڑھوں' بچوں' عورتوں اور متعدد بے گناہ لوگوں کی جانوں کو نشانہ بنانا پڑے' چاہے ان کو قربانی کا بکرا بنانا پڑے' لیکن یہ چیزیں اشتراکی انقلاب لانے کی کوششوں کے لوازم میں شامل ہیں۔ اب فرض کیجیے کہ کوئی شخص شریف النفس ہے' وہ مغالطوں کا شکار ہو کر اشتراکی نظریہ کا معتقد تو ہو گیا' مارکسٹ تو بن گیا' لیکن ان تخریبی کاموں میں حصہ لینے کے لیے تیار نہیں تو وہ حقیقی کمیونسٹ نہیں ہے۔ اس کے لیے ان کاموں میں حصہ لیے بغیر اشتراکی انقلاب نہیں آ سکتا' اس کا ایک طریق کار ہے اس کا ایک set pattern بن چکا ہے۔ اسی طریق سے سمجھ لیجیے کہ اسلامی انقلاب کے لیے بھی صرف وہی طریقہ مفید اور مؤثر ہوگا جس طریقے سے حضور ﷺ نے انقلاب برپا

فرمایا تھا۔ چنانچہ اب ہماری علمی کاوش اور جستجو یہ ہو گی کہ ہم سیرتِ مطہرہ کا معروضی (objectively) مطالعہ کریں اور حضور اکرم ﷺ کے طریق انقلاب کو جاننے کی کوشش کریں۔

مراحلِ انقلاب

میں نے نبی کریم ﷺ کے منہجِ انقلاب کو سمجھنے کے لیے سیرتِ مطہرّہ کا جب مطالعہ کیا تو انقلاب کے مختلف مراحل کا ایک واضح خاکہ میرے سامنے آ گیا اور اس خاکے کی روشنی میں سیرت کے تمام واقعات مجھے انتہائی مربوط و بامعنی معلوم ہوئے۔ میرے مطالعے کا حاصل یہ ہے کہ انقلابی جدّوجُہد کے چھ مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ ہے دعوت و تبلیغ کا۔ یعنی انقلابی نظریئے کی نشر و اشاعت! اسلام کا انقلابی نظریہ ہے نظریۂ توحید۔ جان لیجیے کہ یہ نظریہ نہایت انقلابی ہے اور اس کی زد بہت دُور دُور تک پڑتی ہے۔ سماجی اور معاشرتی میدان میں توحید کا تقاضا یہ ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ سب کا خالق ایک اللہ ہے۔ پیدائشی اعتبار سے کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہیں ہے۔ ذات پات اور حسب و نسب کی بنیاد پر تمام تقسیموں کی مکمل نفی ہو جاتی ہے۔ اسی توحید کی ایک فرع (corollary) یہ ہے کہ حاکم صرف اللہ ہے۔ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (یوسف:۴۰) یعنی حاکمیت مطلقہ صرف اللہ کے لیے ہے۔ انسان کا کام صرف یہ ہے کہ اللہ کی حاکمیت کے نظام کو قائم کرے۔ ہاں اللہ کی عطا کردہ شریعت کے دائرے کے اندر اندر قانون سازی کی جا سکتی ہے۔ سیاست کے میدان میں اس سے بڑا انقلابی نظریہ اور کوئی نہیں ہو سکتا ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آزری

اسی طرح معاشیات کے میدان میں توحید کا تقاضا کیا ہے! ﴿لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ﴾ ’’آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اُن کا مالک صرف اللہ ہے‘‘۔ ملکیت انسان کے لیے ہے ہی نہیں۔ انسان کے پاس جو کچھ ہے بطورِ امانت ہے۔ اصل مالک تو اللہ ہے ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست   در حقیقت مالکِ ہر شے خداست

ملکیت میں تصرّف کا حق لامحدود ہوتا ہے۔ آپ کا مال ہے آپ جو چاہیں کریں‘ میری ملکیّت ہے میں جو چاہوں کروں‘ میری بکری ہے جب چاہوں ذبح کروں مجھے کلی اختیار حاصل ہے۔ لیکن امانت میں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ امانت میں مالک کی مرضی کے مطابق تصرّف ہوگا۔ مالک کی مرضی کے خلاف اگر تصرف کیا جائے گا تو وہ خیانت شمار ہوگا۔ نظریۂ توحید کے تین تقاضے آپ کے سامنے آ گئے۔ معاشرتی سطح پر انسانی مساوات‘ سیاسی سطح پر اللہ کی حاکمیت اور انسان کے لیے خلافت کا تصور اور معاشی سطح پر ملکیت کی بجائے امانت کا تصور!

انقلابی جدوجہد کے دوسرے مرحلے کا عنوان ہے تنظیم۔ یعنی وہ لوگ جو شعوری طور پر توحید کی اس انقلابی دعوت کو قبول کرلیں‘ انہیں منظّم کیا جائے‘ جماعتی شکل میں organize کیا جائے‘ اس لیے کہ محض نظریہ کی دعوت و تبلیغ سے انقلاب نہیں آ سکتا جب تک اس کی پشت پر فدائین اور سرفروشوں کی جماعت نہ ہو۔ اشتراکی انقلاب کو دیکھ لیجیے۔ جب تک اشتراکی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش نہیں کرتے‘ جب تک وہ جیلوں کو نہیں بھر دیتے‘ جب تک وہ پھانسی کے پھندوں کو چوم کر اپنے گلوں میں نہیں ڈالتے‘ کیا کمیونسٹ انقلاب کہیں آ سکتا ہے! اسی طریقے سے اسلامی انقلاب کے لیے ایک جماعت چاہیے‘ جان نثاروں کی جماعت جو پورے طور پر منظّم ہو۔ جس کے لیے ہماری دین کی اصطلاح ہے سمع و طاعت (listen and obey) سنو اور اطاعت کرو۔ گویا ڈسپلن اس نوع کا ہونا چاہیے جیسے فوج میں ہوتا ہے۔ ڈھیلے ڈھالے نظم کے ساتھ انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔

تیسرا مرحلہ ہے تربیت اور تزکیہ کا‘ یعنی جس اللہ کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہو‘ اس کے احکام کو پہلے اپنے اوپر نافذ کرو۔ جس رسول ﷺ کے اتباع میں انقلاب برپا کرنے چلے ہو‘ پہلے اس رسولؐ کی ہر اَدا کو اپنی سیرت میں جذب کرو۔ جب تک یہ نہیں ہوگا کوئی کوشش بار آور نہیں ہوگی۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص بہت فعال ہے‘ تنظیمی اور جماعتی کاموں میں لگا رہتا ہے‘ بہت بھاگ دوڑ کرتا ہے‘ لیکن اس سے دین کے احکام پر عمل میں کسل مندی‘ تساہل اور بے رغبتی کا اظہار ہوتا ہے‘ تو ایسے سپاہیوں سے گاڑی نہیں چلے گی۔ ایسے لوگ کسی امتحان کے مرحلہ میں خالی کارتوس ثابت ہوں گے۔ لہٰذا تیسرا نہایت اہم مرحلہ

ہے تربیت اور تزکیہ کا۔ صحابہ کرامؓ حضور نبی کریم ﷺ کی تربیت کا شاہکار تھے، ہمارے لیے اصل آئیڈیل وہ ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ جو تربیت حضور ﷺ نے فرمائی تھی صحابہ کرامؓ کی اس کی کوئی اور نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ وہ بات ہے جس کی گواہی دشمنوں کی طرف سے ملی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب سپاہِ اسلام ایرانیوں کے خلاف صف آرا تھیں تو رستم سپہ سالارِ افواجِ ایران نے مسلمان فوجوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے کچھ جاسوس بھیجے۔ وہ بھیس بدل کر مسلمانوں کے کیمپ میں کچھ دن تک حالات کا مشاہدہ کرتے رہے۔ واپس جا کر انہوں نے رستم کو رپورٹ پیش کی کہ هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ ''یہ عجیب لوگ ہیں، رات کو راہب نظر آتے ہیں اور دن میں شہ سوار ہیں''۔ دُنیا نے یہ دونوں چیزیں علیحدہ علیحدہ تو دیکھی تھیں۔ عیسائی راہب بڑی تعداد میں موجود تھے۔ آپ نے بحیرہ راہب کا واقعہ سنا ہوگا جس نے حضور ﷺ کو آپ کے بچپن میں پہچان لیا تھا۔ حضور ﷺ کے زمانہ تک عیسائیوں میں بڑے مخلص راہب موجود تھے۔ انہی میں وہ راہب بھی تھا جس نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کا پتا دیا کہ جاؤ میرا علم بتاتا ہے کہ کھجوروں کی سرزمین میں نبی آخر الزمان کے ظہور کا وقت آگیا ہے، جاؤ قسمت آزمائی کرو۔ اندازہ لگایئے کہ وہ کتنا بڑا عالم و راہب ہوگا۔ لیکن جو راہب ہوتے تھے وہ دن کے وقت بھی راہب ہوتے تھے اور رات کے وقت بھی۔ ان کے ہاتھ میں تلوار تو نظر نہیں آتی۔ اسی طرح قیصر و کسریٰ کی افواج بھی موجود تھیں، لیکن جو دن کا فوجی ہے وہ رات کا بھی فوجی ہے۔ جہاں رات کو فوج کا پڑاؤ ہو جاتا تھا وہاں آس پاس کی کسی عورت کی عصمت کا محفوظ رہ جانا ایک معجزہ ہوتا تھا۔ گُل چھرے اڑائے جا رہے ہیں، شراب کے دَور چل رہے ہیں، دل کھول کر عیاشی ہو رہی ہے۔ اب نبی اکرم ﷺ کی تربیت و تزکیہ کا کمال دیکھئے کہ دو متضاد چیزوں کو جمع کر دیا۔ صحابہ کرامؓ کی سیرت و کردار پر اس سے زیادہ جامع تبصرہ ہو ہی نہیں سکتا کہ '' هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ '' کہ رات کو یہ راہب نظر آتے ہیں، اللہ کے حضور سربسجود ہیں، قیام کی حالت میں قرآن کی تلاوت ہو رہی ہے اور سجدہ گاہیں آنسوؤں سے تر ہیں، لیکن دن کے وقت یہی لوگ بہترین شہ سوار ہیں اور نہایت دلیری سے لڑتے ہیں۔

تو جان لیجیے کہ کسی انقلابی جدّوجہد کے یہ تین ابتدائی مراحل ہیں۔ دعوت‘ تنظیم اور تربیت وتزکیہ۔ ان تینوں کا حاصل یہ ہے کہ ایک انقلابی جماعت وجود میں آئے جو ایک طاقت اور قوّت بن جائے۔ اس قوّت وطاقت کا کام یہ ہے کہ جب تک یہ طاقت بڑھ رہی ہے‘ grow کر رہی ہے‘ اپنے آپس کے روابط وتعلق کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرے۔ اپنی تنظیم کو مضبوط سے مضبوط تر کرے‘ اپنی دعوت کے ذریعے سے اپنے حلقۂ اثر اور base کو وسیع کرنے کی جدّوجُہد کرے‘ جب تک اتنی طاقت نہیں ہو جاتی کہ وہ باطل سے ٹکرا سکے اس وقت تک صبرِ محض پر عامل رہے۔ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ ’’ہاتھ بندھے رکھو!‘‘ چاہے تمہارے ٹکڑے اڑا دیے جائیں‘ تم ہاتھ مت اٹھاؤ۔ میں اس کا اجمالی تذکرہ پہلے کر چکا ہوں۔ انقلابی جدّوجُہد میں اس صبر محض (passive resistance) کی بہت اہمیت ہوتی ہے‘ اس لیے کہ اگر ابتدائی مراحل میں انقلابی جماعت تشدد پر اتر آئے‘ violent ہو جائے تو اس معاشرے میں موجود باطل نظام کو اِس بات کا اَخلاقی جواز حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اس مختصر سی انقلابی طاقت کو کچل ڈالے۔ اس کے برعکس اگر وہ انقلابی جماعت صبر محض کی پالیسی کو اختیار کرے اور ظالموں کی جانب سے تشدّد کو جھیل جائے تو اس معاشرے کی رائے عامہ اس جماعت کے حق میں ہموار ہوتی چلی جائے گی۔ قدرتی طور پر رائے عامہ کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر اِن لوگوں کو کیوں ایذائیں دی جا رہی ہیں‘ ان کا جرم کیا ہے؟ کیا انہوں نے چوری کی ہے‘ یا ڈاکہ ڈالا ہے؟ کیا کسی کی ناموس و آبرو پر ہاتھ ڈالا ہے؟ کیا کسی غیر اَخلاقی حرکت کا ارتکاب کیا ہے؟ ان لوگوں کا بس ایک جرم ہے کہ اللہ کو مانتے ہیں اور محمد ﷺ کے دامن سے وابستہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ میں حکم یہی تھا کہ ہاتھ باندھے رکھو۔ مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ کفار کی طرف سے مسلمانوں پر بدترین تشدد ہوا جسے مسلمانوں نے کمال صبر سے برداشت کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ مکہ کے تمام لوگ تو سنگ دل نہیں تھے۔ وہاں کی خاموش اکثریت تو دیکھ رہی تھی کہ مسلمانوں کو ناحق ستایا جا رہا ہے اور یہی مسلمانوں کی اخلاقی فتح تھی جو بعد میں غزوۂ بدر میں اس طرح ظاہر ہوئی کہ تین سو تیرہ بے سروسامان لشکر کے سامنے ایک ہزار کا مسلّح لشکر ٹھہر نہ سکا اور مسلمانوں نے کفار کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔

تو یہ صبرِ محض اس انقلابی تحریک کا نہایت اہم مرحلہ ہے۔ جب ہم ان مراحل کو ترتیب وار شمار کرتے ہیں تو صبرِ محض چوتھا مرحلہ قرار پاتا ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ مرحلہ دعوت کے پہلے دن سے شروع ہو جاتا ہے اور ابتدائی تینوں مراحل یعنی دعوت' تنظیم اور تربیت کے شانہ بشانہ چلتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ تعذیب وتشدّد پر صبر واستقامت کا مظاہرہ کرنا اور اپنے موقف پر ڈٹے اور جمے رہنا انتہائی مشکل مرحلہ ہوتا ہے اور یہ صبر محض اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک اتنی طاقت نہ ہو جائے کہ اس نظام کے ساتھ باضابطہ تصادم مول لے سکے۔ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ٹکراؤ کے بغیر انقلاب نہیں آتا' ٹھنڈے ٹھنڈے وعظ اور نصیحت سے انقلاب کبھی نہیں آیا' لیکن پختہ ہوئے اور مناسب تیاری کے بغیر ٹکراؤ ہو گیا تو تمام جدوجہد اکارت جائے گی۔ تقریر کے آغاز میں مَیں نے آپ کو بتایا تھا کہ کوئی وجہ ہے کہ بارہ برس تک مشرکین کی طرف سے مکّہ میں شدید ترین تشدّد (persecution) ہو رہا ہے' انتہائی ایذا رسانی کا سلسلہ جاری ہے' لیکن حضور ﷺ کی طرف سے جوابی کارروائی کی اجازت نہیں ہے۔ ہر نوع کے جور وستم کو برداشت کرو' اگر اللہ ہمت دے تو ان کی گالیوں کے جواب میں دعائیں دو۔ اس طرح اہلِ ایمان کا امتحان بھی ہو رہا تھا' تربیت بھی ہو رہی تھی۔

لیکن جب طاقت اتنی فراہم ہو جائے کہ وہ انقلابی جماعت یہ محسوس کرے کہ اب ہم برملا اور کھلم کھلا باطل کو چھیڑ سکتے ہیں' اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں' تو انقلاب کا پانچواں مرحلہ شروع ہو جائے گا جس کا عنوان ہے اقدام یعنی active resistance۔ یعنی اب اُس نظام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑا جائے گا۔ میں اس وقت اس معاملے کو بہت اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ اس میں قدرے تفصیل کی ضرورت ہے۔ جاننے کا شوق اگر دل میں پیدا ہو جائے تو میری کتاب ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' کا مطالعہ کیجیے جس کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ ہمارے دَور میں اگر کوئی ایسی اسلامی انقلابی جماعت وجود میں آ جائے تو یہ فیصلہ کرنا کہ اب کافی طاقت فراہم ہو گئی ہے اور اقدام کا مرحلہ آ گیا ہے' اس کا انحصار امیر کے اجتہاد اور assessment پر ہو گا۔ نبی اکرم ﷺ کے لیے تو یہ فیصلہ اللہ کی طرف سے تھا۔ ہجرت ہو رہی ہے' ساتھ ہی آیت نازل ہو گئی: ﴿اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ

عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ﴿۳۹﴾ (الحج) اجازت دی جا رہی ہے ان لوگوں کو جن پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے تھے کہ آج ان کے ہاتھ کھول دیے گئے‘ اب وہ بھی retaliate کر سکتے ہیں‘ بدلہ لے سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ کس کی طرف سے آیا! اللہ کی طرف سے‘ وحی کے ذریعے سے۔ اب وحی تو نہیں آئے گی۔ اب یہ فیصلہ اجتہاد سے ہوگا۔ اب فہم وادراک کی پوری قوتیں کام میں لا کر فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم باطل نظام کے ساتھ ٹکر لے سکتے ہیں! اگر مشورے کے بعد امیر جماعت کی یہ رائے بن گئی کہ ہمارے پاس معتد بہ تعداد میں ایسے کارکن موجود ہیں جو منظّم ہیں‘ سمع وطاعت کے خوگر ہیں‘ ان کا تعلق مع اللہ مضبوط ہے‘ ان کی اسلامی نہج پر تربیت ہو چکی ہے‘ تزکیۂ نفس کی وادی سے وہ گزر چکے ہیں‘ اللہ کی راہ میں جان دینے کو وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی سمجھتے ہیں‘ وہ سینوں پر گولیاں کھانے کو تیار ہیں‘ پیٹھ نہیں دکھائیں گے‘ اگر لاٹھیوں کی بارش ہوگی تو وہ بھاگیں گے نہیں‘ جیلوں میں بھرا جائے گا تو وہ جیلوں کو بھر دیں گے‘ کوئی معافی مانگ کر نہیں نکلے گا۔ جب اندازہ ہو کہ ہمارے پاس اتنی طاقت ہے تو پھر چیلنج کیا جائے گا اور آگے بڑھ کر اقدام کیا جائے گا۔

سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں یہ اقدام ہمیں اس شکل میں ملتا ہے کہ حضورؐ نے مدینہ تشریف لے جا کر ٹھنڈی چھاؤں میں آرام نہیں فرمایا۔ مستشرقین اور مغربی مؤرخین کی ہرزہ سرائی دیکھئے کہ وہ ہجرت کا ترجمہ کرتے ہیں Flight to Madina۔ فلائٹ کا ترجمہ ہوگا فرار۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ فرار ہوتا ہے کسی مصیبت سے بچنے کے لیے بھاگ کر کہیں پناہ لینا۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ جا کر معاذ اللہ پناہ نہیں لی تھی۔ ہجرت دراصل عنوان ہے اس کا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ اور ان کے اعوان وانصارؓ کے لیے ایک base فراہم کر دی تھی کہ جہاں سے اسلامی انقلاب کی تحریک کو launch کرنا ہے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ حضورؐ نے مدینہ تشریف لا کر صرف چھ مہینے داخلی استحکام پر صَرف فرمائے ہیں۔ اس عرصہ میں حضورؐ نے تین کام کیے ہیں۔ پہلا کام مسجد نبوی کی تعمیر‘ یہ مرکز بن گیا۔ دوسرا کام مہاجرینؓ اور انصارؓ کی مواخات اور تیسرا کام آپؐ نے یہ کیا کہ یہود کے تین قبیلوں سے معاہدے کر لیے۔ ان کو معاہدوں میں جکڑ لیا۔ طے پا گیا کہ وہ اپنے مذہب پر قائم

رہیں گے‘ ان کے تمام شہری حقوق محفوظ رہیں گے‘ لیکن اگر کبھی کسی طرف سے مدینہ پر حملہ ہوا تو وہ مسلمانوں کا ساتھ دیں گے یا بالکل غیر جانب دار رہیں گے۔

ان ابتدائی چھ مہینوں کے بعد راست اقدام کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ آپؐ نے چھاپہ مار دستے بھیجنے شروع کر دیے۔ قریش کی شہ رگ (life line) پر ہاتھ ڈالا اور ان کے تجارتی قافلوں کو مخدوش بنا دیا۔ ان مہموں کے متعلق میں اجمالاً گفتگو کر چکا ہوں۔ درحقیقت اس اقدام کا نتیجہ تھا کہ قریش کا ایک ہزار کا لشکر پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر حملہ آور ہوا تھا — سانپ بل سے باہر نکل آیا تھا — اور اس طرح انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ و السلام کا چھٹا اور آخری مرحلہ یعنی مسلّح تصادم (armed conflict) کا آغاز ہو گیا۔ اب تلواریں اور نیزے ہیں‘ مقابلہ ہے۔ تلوار تلوار سے ٹکرا رہی ہے۔ یہ چھٹا اور آخری مرحلہ (final phase) چھ سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس دوران میں ہر طرح کی اونچ نیچ آئی۔ بدر میں ستر کافر مارے گئے‘ چودہ مسلمان شہید ہوئے۔ اُحد میں ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔ نشیب و فراز آئے ہیں۔ ﴿یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ﴾ (التوبۃ: ۱۱۱) ”وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں“۔ اللہ کی طرف سے یہ ضمانت نہیں تھی کہ اے اہلِ ایمان! میری راہ میں جنگ کرو‘ تم میں سے کسی کو کوئی آنچ نہیں آئے گی‘ یہ گارنٹی تو کہیں نہیں دی گئی تھی۔ تم کو تو اپنی جانیں دے کر اپنی صداقت کا ثبوت دینا ہے۔ عام اہل ایمان کو کہاں گارنٹی ملتی‘ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی گارنٹی نہیں تھی۔ طائف میں جب حضورؐ پر پتھراؤ ہوا ہے تو آپؐ کا جسدِ اطہر لہولہان ہوا کہ نہیں ہوا!! اُحد میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر تلوار کا وار پڑا ہے تو آپؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے کہ نہیں ہوئے! خون کا فوارہ چھوٹا کہ نہیں چھوٹا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسارِ مبارک پر خود کی دو کڑیاں گھسیں کہ نہیں گھسیں! یہ سب کچھ ہوا۔ ہاں ان تمام آزمائشوں سے گزرنے کے بعد‘ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لگا دینے کے بعد وہ مرحلہ بھی آتا ہے کہ اللہ کی غیبی تائید و نصرت آ کر رہتی ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ کامیابی قدم چومے گی: ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝۱۳۹﴾ (آل عمران) ”اور تم ہی سربلند رہو گے اگر تم مؤمن ہوئے“۔

دورِ حاضر میں انقلابِ اسلامی کا طریق کار

اسلامی انقلاب کے منہج کے یہ چھ مراحل ہیں جنہیں میں نے یہاں نہایت مختصر انداز میں بیان کیا ہے۔ اس انقلابی عمل (revolutionary process) کو میں نے حضور ﷺ کی سیرتِ مبارکہ سے سمجھا ہے اور اس معاملے میں میرا ماخذ صرف اور صرف سیرتِ محمدیؐ ہے۔ اب ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ کروں گا اور وہ یہ کہ اس انقلابی عمل کے ابتدائی چار مراحل ہر دور میں بعینہٖ اسی طرح رہیں گے جیسے ہمیں سیرتِ مطہرہ میں نظر آتے ہیں۔ یعنی اسلامی انقلابی جدوجہد کا پہلا مرحلہ دعوت وتبلیغ کا ہوگا۔ اس میں قرآن کو مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہوگی اور انقلابی نظریہ توحید ہی کا ہوگا۔ بقول اقبال ؎

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علمِ کلام!

آج کے دور میں توحید بریلویوں اور اہلِ حدیث کے درمیان بحث ونزاع کا ایک مسئلہ بن کر رہ گئی ہے‘ اس پر کھینچ تان ہو رہی ہے‘ ورنہ حقیقت میں توحید تو پورے ایک نظام تمدن‘ ایک نظامِ اجتماعی‘ ایک نظامِ عدل وقسط کی بنیاد ہے۔ دوسرا مرحلہ ہے تنظیم۔ یہاں بھی ہمیں سیرتِ مطہرہ سے حاصل ہونے والے اُسوہ کو جوں کا توں اختیار کرنا ہوگا۔ اس تنظیم کے معاملے میں میرے نزدیک حضور ﷺ نے جو رہنمائی اُمت کو دی ہے وہ ہے نظامِ بیعت۔ اجتماعیت کے لیے بنیاد بیعت ہوگی۔ میری اس رائے سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے‘ لیکن میری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ اسلامی انقلاب کے لیے ایک جماعت اور ایک تنظیم کی تاسیس کے لیے سیرت مطہرّہ میں بیعت کی سنت کے علاوہ کوئی دوسری صورت موجود نہیں ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث ملتی ہے‘ جس کی صحت پر اُمت کے دو جلیل القدر محدّثین امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہما متفق ہیں۔ سند کے اعتبار سے متفق علیہ سے زیادہ کسی روایت کا مقام نہیں ہوتا۔ اس حدیث کے الفاظ اس قدر جامع ہیں کہ میرا گہرا تاثر یہ ہے کہ اس حدیث میں ایک صحیح اسلامی انقلابی تنظیم یا جماعت کا پورا دستور موجود ہے۔ میں آپ حضرات سے درخواست کروں گا کہ اس حدیث

اور اس کے ترجمہ اور تشریح کو پوری توجہ اور غور کے ساتھ سماعت فرمائیے۔ حدیث ہے:

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ ؓ قَالَ بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ وَعَلٰی اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ

''حضرت عبادہ بن صامت ؓ سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی کہ جو حکم آپ ہمیں دیں گے ہم سنیں گے اور مانیں گے' چاہے آسانی ہو چاہے تنگی ہو' چاہے وہ ہمارے نفس کو اچھا لگے چاہے اس کے لیے ہمیں اپنے نفس کو مجبور کرنا پڑے اور چاہے آپؐ ہم پر دوسروں کو ترجیح دیں' اور جس کو بھی آپؐ امیر مقرر فرما دیں گے ہم اس کا حکم مانیں گے اور اس سے جھگڑیں گے نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو ہماری رائے ہوگی اور جس بات کو ہم حق سمجھیں گے اس کو بیان ضرور کریں گے' ہم جہاں کہیں بھی ہوں۔ اور اللہ کے معاملہ میں حق بات کہنے سے ہم کسی ملامت گر کی ملامت سے ہرگز نہیں ڈریں گے۔''

یہ ہے میرے نزدیک تنظیم کے مرحلے کے لیے نبی اکرم ﷺ کی سنّت۔ اس میں صرف یہ فرق ملحوظ رکھنا ہوگا کہ حضور کی اطاعت مطلق تھی' اس لیے کہ حضور کا ہر فرمان معروف کے حکم میں تھا' لیکن آپؐ کے بعد اب کسی بھی امیر کی اطاعت آزاد نہیں ہوگی بلکہ معروف کے دائرے کے اندر اندر ہوگی۔ تربیت کے مرحلے میں بھی ہمیں پورے طور پر نبوی طریق کی پیروی کرنا ہوگی۔ اس میں اہم ترین چیز ہے عباداتِ مفروضہ کا اہتمام اور ان کی پابندی' مزید برآں تلاوتِ قرآن اور حتی الامکان قیام اللّیل کا اہتمام۔ اسی طرح صبرِ محض کے مرحلے کو بھی ہمیں بعینہٖ اسی طرح اختیار کرنا ہوگا جس طرح ہمیں سیرت میں مکی دور میں نظر آتا ہے۔ یعنی دعوت و تبلیغ کے اس کام میں اور اقامتِ دین کی اس جدّوجہد میں جو مصائب اور شدائد آئیں ان پر صبر کرنا' ثابت قدم رہنا' اور اپنا ہاتھ روک کر رکھنا۔ یہ وہ چار ابتدائی مراحل ہیں جن میں ہمیں طریق نبویؐ کو جوں کا توں اختیار کرنا ہے۔

البتہ اسلامی انقلابی جدّوجہد کے پانچویں اور چھٹے مرحلے یعنی اقدام اور مسلّح اقدام کے معاملے میں ہمیں احوال وظروف کی مناسبت سے کچھ ترمیم کرنی ہوگی اور اجتہاد سے کام

لینا ہوگا۔ اس کی وجہ سمجھ لیجیے۔ پہلی بات یہ کہ نبی اکرم ﷺ کا جس معاشرے سے معاملہ تھا' وہ تمام اعتبارات سے خالص کافرانہ معاشرہ تھا۔ آج کسی بھی مسلمانوں کے ملک میں یہ جدّوجُہد ہو گی تو سابقہ مسلمانوں سے پیش آئے گا چاہے اس ملک میں حکمران اور عامۃ المسلمین کی اکثریت فاسق وفاجر افراد پر مشتمل ہو۔ وہ سیکولر (secular) ذہن رکھتے ہوں' لیکن کلمہ گو تو ہیں' شمار تو ان کا مسلمان ہی میں ہوتا ہے۔ ایک معاملہ تو یہ ہے جس کی وجہ سے صورتِ حال میں فرق واقع ہوگیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس زمانہ میں طاقت کا زیادہ فرق نہیں تھا' جو تلواریں اُدھر مشرکین وکفار کے پاس تھیں وہی مسلمانوں کے پاس تھیں۔ مقدار اور تعداد (quantity) کا فرق ضرور تھا' لیکن نوعیت (quality) کا فرق نہیں تھا۔ وہی نیزہ' تلوار' تیر کمان اُن کے پاس ہے وہی اِن کے پاس ہے۔ وہی گھوڑے اور اونٹ اِدھر ہیں' وہی اُدھر ہیں۔ لیکن آج کل جو استحصالی نظام بھی قائم ہے' خواہ وہ سرمایہ دارانہ ہو یا جاگیردارانہ' اس کو تحفظ دینے والی حکومت ہوتی ہے جو انہی طبقات کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کے مفادات رائج الوقت نظام سے بڑی مضبوطی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا مقابلہ میں حکومت آتی ہے۔ اس کے پاس بے پناہ قوت وطاقت ہے۔ چنانچہ مسلح تصادم والی بات موجودہ دور میں بڑی مشکل ہے۔ اس کا کوئی بدل تلاش کرنا پڑے گا۔ وہ متبادل طریقے تمدّن کے ارتقاء نے فراہم کیے ہیں۔ پُرامن مظاہرے' پکٹنگ کرنا' گھیراؤ کرنا' چیلنج کرنا کہ فلاں فلاں کام جو اسلام کی رو سے منکر ہیں' ہم یہاں نہیں ہونے دیں گے۔ یہ کام اگر ہوگا تو ہماری لاشوں پر ہوگا۔ یہ وہ راستے ہیں جو تمدن کے ارتقاء کی بدولت ہمارے لیے کھلے ہیں۔ جب تک یہ مرحلہ نہیں آتا صرف زبان وقلم سے اس کا اظہار کیا جائے گا کہ یہ کام اسلام کے خلاف ہیں' منکر ہیں' حرام ہیں۔ ان کو چھوڑ دو' ان سے باز آجاؤ' ان کی جگہ معروفات کو رائج کرو' لیکن جب وہ وقت آجائے کہ اسلامی انقلابی جماعت یہ سمجھے کہ ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم مظاہروں کے ذریعے سے حکومت کو مجبور کر سکتے ہیں تو پھر چیلنج کیا جائے گا کہ اب یہ کام ہم نہیں ہونے دیں گے' سڑکوں پر نکل آئیں گے' پُرامن مظاہرے کریں گے' دھرنا مار کر بیٹھیں گے' پکٹنگ کریں گے۔ اس کے نتیجہ میں لاٹھی چارج ہوگا' گرفتاریاں ہوں گی' جیلوں میں بھرے جائیں گے۔ حکومت اور آگے بڑھے گی تو

فائرنگ ہوگی‘ شیلنگ ہوگی۔ تو جب اس جماعت کے وابستگان نے پہلے ہی جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے‘ وہ سر پہ کفن باندھ کر نکلے ہیں کہ ؏ ”شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن“ تو پیٹھ دکھانے کا کیا سوال! اب یا تو حکومت گھٹنے ٹیک دے گی‘ اس لیے کہ آخر فوج بھی اسی ملک کی ہے اور عوام بھی اسی ملک کے ہیں۔ اپنوں کے خون سے ہاتھ کب تک رنگ سکیں گے۔ یا پھر نذرانہ جان اپنے ربّ کے حضور پیش کر کے اس تنظیم کے ارکان سرخرو ہو جائیں گے۔

اس کی ایک مثال اس دَور میں ایرانیوں نے پیش کر کے دکھا دی ہے۔ اگرچہ ایران میں انقلاب کے پہلے چار مراحل پر مطلوبہ درجہ میں کام نہیں ہوا تھا‘ اس میں بہت سی خامیاں رہ گئی تھیں۔ اس کے بارے میں اس وقت میں گفتگو نہیں کرنا چاہتا‘ لیکن ایک چیز انہوں نے کر کے دکھا دی۔ انہوں نے شاہ کے خلاف مسلح بغاوت نہیں کی تھی‘ انہوں نے ہتھیار ہاتھ میں نہیں لیے‘ خود جانیں دینے کے لیے سڑکوں پر آ گئے۔ ہزاروں مارے گئے‘ کوئی پروا نہیں۔ لیکن ان قربانیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ پولیس عاجز آ گئی اور فوج نے مظاہرین پر گولیاں چلانے سے انکار کر دیا اور آخر کار شہنشاہ کو بھاگتے بنی اور اس کا انجام یہ ہوا کہ ؏ ”دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں“۔ وہ شہنشاہ جو اس علاقہ میں امریکہ کا سب سے بڑا پولیس مین تھا‘ اسے امریکہ بہادر نے بھی اپنے یہاں پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ وہ کون سی طاقت تھی جس نے شہنشاہِ ایران کو حکومت چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا! وہ عوام کا جذبہ اور جان قربان کرنے پر آمادگی کی طاقت تھی۔ اس کے بغیر نظام نہیں بدلتا۔ تو اس معاملے میں اجتہاد سے کام لیتے ہوئے ہمیں موجودہ حالات کے پیش نظر صبرِ محض ہی کی پالیسی پر کاربند رہتے ہوئے اقدام کرنا ہوگا‘ مسلح تصادم کی نوبت نہیں آئے گی۔

البتہ جہاں حالات سازگار ہوں‘ جہاں مسلح تصادم ہو سکتا ہو وہاں ہوگا۔ جیسے اب افغانستان میں ہو رہا ہے۔ وہاں اس لیے ہو رہا ہے کہ ایک تو وہ قوم عرصہ سے آزاد قوم کے طور پر دنیا کے نقشے پر موجود رہی ہے‘ اس پر مغربی استعمار کا براہ راست غلبہ نہیں ہوا‘ وہ برصغیر پاک و ہند کی طرح دو سو برس تک غلام نہیں رہے۔ دوسرے یہ کہ وہاں ہتھیار عام ہیں۔ کوئی گھر شاید ہی ایسا ہو جس میں ہتھیار نہ ہوں۔ ان کے بچے تو بچپن ہی سے بندوق اور رائفل سے کھیلتے چلے آ رہے ہیں۔ پھر وہ علاقہ ایسا ہے کہ وہاں گوریلا جنگ ممکن ہے۔ ہمارا علاقہ

ایسا ہے کہ اس میں گوریلا وار ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن اگر کہیں مسلح تصادم کے لیے حالات سازگار ہوں تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ہے کہ وہاں نہی عن المنکر کے لیے طاقت کا استعمال کیا جا سکتا ہے' تلوار اٹھائی جا سکتی ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ کسی مسلمان فاسق و فاجر حکمران کے خلاف مسلح بغاوت کا راستہ بالکل بند کر دیا گیا ہو۔ بغاوت ہو سکتی ہے۔ البتہ فقہاء کرام نے اس کے لیے شرط یہ عائد کی ہے کہ طاقت اتنی ہو جائے کہ اپنے اندازے اور جائزے کی حد تک کامیابی کا واضح امکان نظر آتا ہو۔ باقی عملاً کیا ہو گا؟ تو بہت سے ان دیکھے عوامل ایسے پیدا ہو سکتے ہیں کہ آپ یقین سے نتیجہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بہرحال یہ معاملہ اگرچہ مشروط ہے لیکن اتنی بات تو ثابت ہے کہ مسلح بغاوت حرام مطلق نہیں ہے۔

لیکن ہمارے ملک کے حالات میں عملاً مسلح بغاوت ممکن نہیں ہے۔ اس کا بدل ہے پُرامن اور منظّم مظاہرے اور وہ تمام اقدامات جن کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ اس طرح ہم اللہ کی راہ میں جان تو دے سکتے ہیں۔ ہمارے پاس دینے کی چیز جان ہی ہے جو ہم دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے آمادگی ضرور رہنی چاہیے۔ اس معاملے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثیں سنا دوں۔ یہ حبِّ رسول' یا محبتِ رسولؐ یا اتباعِ رسول ہی کا تقاضا ہو گا کہ ہماری قلبی کیفیات حدیث رسول کے مطابق بن جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اَغْزُوْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَاُقْتَلُ ثُمَّ اَغْزُوْ فَاُقْتَلُ ثُمَّ اَغْزُوْ فَاُقْتَلُ)) (صحیح مسلم) ''اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! میری یہ شدید آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جنگ کروں اور قتل کر دیا جاؤں' پھر (مجھے زندہ کیا جائے اور پھر) میں اللہ کی راہ میں جہاد کروں اور قتل کر دیا جاؤں۔ پھر (مجھے زندہ کیا جائے اور پھر) میں اللہ کی راہ میں جہاد کروں اور قتل کر دیا جاؤں''۔ اس آرزو کا ہر مسلمان کے دل میں ہونا ایمان کی علامت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا لازمی تقاضا ہے۔ اسی طریقے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''جس کسی مسلمان نے اللہ کی راہ میں نہ کبھی جنگ کی اور نہ اس کے دل میں اس کی آرزو تھی تو اگر اس حال میں اس کو موت آئی تو اس کی موت ایک نوع کے نفاق پر ہو گی''۔ گویا یہ ایمان کی شرطِ لازم ہے کہ یہ آرزو دل میں موجود ہو کہ اے اللہ! تیرے دین کی سربلندی کے لیے یہ جان کام آئے' گردن کٹے' اس جسم کے ٹکڑے ہو

جائیں۔ اس خواہش کا ہونا ضروری ہے خواہ اس کا مرحلہ نہ آئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی بہت سے ایسے ہیں کہ جن کا انتقال جنگ کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے ہو گیا۔ ہو سکتا ہے مکی دَور میں کسی صحابی کی طبعی موت واقع ہو گئی ہو۔ ان کے لیے میدانِ جنگ میں گردن کٹانے کی نوبت آئی نہیں۔ اسی طرح عین ممکن ہے کہ ہماری زندگیوں میں اللہ کی راہ میں جانی قربانی دینے کا مرحلہ نہ آئے' لیکن دل میں نیت ہو' آرزو ہو' تمنا ہو' تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے واثق اُمید ہے کہ وہ اس پر بھی اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔

میری اس وقت کی گفتگو کا خلاصہ ذہن نشین کر کے اٹھیے۔ حُبِ رسول کا بنیادی تقاضا ہے اتباعِ رسولؐ۔ یہ اتباع زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی مطلوب اور مبارک ہے' لیکن اس کا اصل تقاضا یہ ہے کہ ہماری زندگی کا پورا رخ وہی ہو جائے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا تھا۔ اور وہ رخ تھا غلبہ دین کی جدّوجُہد کا رخ' نظامِ عدل وقسط کا عملاً قیام ونفاذ! اسی مشن کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئیس (۲۳) سال تک جاں گُسل محنت ومشقت کی' اسی کے لیے صحابہ کرام نے زندگیاں کھپا دیں۔ مصائب جھیلے' مظالم برداشت کیے' جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ حضور اور صحابہ کرام کے نقشِ قدم پر ہماری زندگی کا رخ معین ہو جائے' ہماری دلچسپیاں اور ہمارے ذوق وشوق سیرتِ رسولؐ اور سیرتِ صحابہؓ کے سانچے میں ڈھل جائیں' یہی حبِ رسول کا اصل تقاضا ہے ؎

میری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی!

حاصل کلام

سیرتِ مطہرہ کے ایک اجمالی نقشہ کے ذریعے سے میں نے آپ حضرات کے سامنے حبِ رسول کے تقاضے بیان کر دیے ہیں۔ اس انداز میں غور وفکر کی ضرورت ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ میری ہر بات کو تسلیم کر لیں' لیکن میرا نقطہ نظر آپ کے سامنے آیا ہے' اس پر ٹھنڈے انداز میں سوچ بچار کیجیے اور ضرورت محسوس ہو تو مجھ سے یا تنظیم کے ذمہ دار حضرات سے تبادلۂ خیال کیجیے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ ربِّ العالمین OO